علی گڑھ میں علامہ میمنی کے روز و شب

محمد محمود میمن

لاہور کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر والد محترم پروفیسر عبدالعزیز میمن نے ۱۴ نومبر ۱۹۲۵ء سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ عربی میں بطور ریڈر اپنی ملازمت کا آغاز کیا ۔ علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر بشیر الدین احمد صدیقی نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں والد صاحب کے تقرر پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا "مولانا عبدالحق صاحب حقّی بغدادی مرحوم کے بجائے عربی ڈیپارٹمنٹ میں ایک نہایت قابل قدر اضافہ ہوا ہے ۔ مولانا عبدالعزیز میمن صاحب ہمارے تعارف اور تحسین سے مستغنی ہیں ۔ ان کا علمی ذوق اور ادب عربی میں ان کی عالمانہ تحقیق ان کو ان بلندیوں پر پہنچا چکی ہے جہاں لوگ بمشکل پہنچتے ہیں ۔ مولانا کی مختلف اور متعدد عربی تصانیف مصر اور لاہور میں شائع ہو چکی ہیں اور باکمالان ادب سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں ۔ ہم کو امید ہے ہماری یونیورسٹی مولانا کے تبُحر علمی سے مستفید ہوگی اور علی گڑھ کی فضا مولانا کے مزید اکتسابات علمی کی محرّک ہوگی " (علی گڑھ میگزین جوبلی نمبر " ۱۹۲۵ء صفحہ ۱۰) ۔ علی گڑھ کی طرف دلوں کو کھینچنے اور نوجوانان قوم کو کلمہ خیر سنانے کے لئے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی جوبلی منعقدہ دسمبر ۱۹۲۵ء کے موقع پر والد صاحب نے عربی میں ایک قصیدہ لکھا جو جوبلی میں پڑھ کر سنایا اور جو علی گڑھ میگزین میں شائع بھی ہوا ۔

یونیورسٹی کی حدود میں مکان نہ ملنے کے سبب ہم لوگوں نے شہر میں حکیم کی سرائے میں ایک مکان میں رہائش اختیار کی ۔ شہر اور یونیورسٹی کے درمیان تقریباً دو میل کا فاصلہ ہوگا ۔ کچھ عرصہ بعد یونیورسٹی میں انتظام ہو گیا اور ہم وہاں منتقل ہو گئے ۔ ہمارے آس پاس مندرجہ ذیل حضرات رہائش پذیر تھے : بشیر صاحب (لائبریرین) ، ڈاکٹر اسحاق مرحوم (فزکس) ، پیرزادہ صاحب (انگریزی) ، اللہ بخش صاحب مرحوم (کیمسٹری) ، حبیب الرحمن صاحب مرحوم (ٹریننگ کالج) ، منظور حسین خان صاحب مرحوم (برسر) اور شیخ عبدالرشید صاحب (تاریخ) ۔ ۱۹۳۲ء میں والد صاحب نے نابینا مدرسہ اور بنگالی کوٹھی سے کچھ فاصلہ پر بریلی لائن کے قریب اپنی ذاتی کوٹھی تعمیر کر لی جس کا نام میمن منزل رکھا اور پھر ہم اس کوٹھی میں منتقل ہو گئے ۔

ان دنوں بھی والد صاحب اپنے روزمرہ کے معمولات پر سختی سے کاربند رہتے تھے اور انہیں کسی مجبوری کے تحت بھی اپنے معمولات میں کسی قسم کی تبدیلی بہت شاق گذرتی تھی ۔ زندگی ایک مشینی انداز میں رواں دواں تھی ۔ صبح سویرے اٹھتے ضروریات سے فارغ ہو کر وضو کرتے اور نماز فجر ادا کرتے ۔ اس کے بعد تقریباً دو تین میل کی سیر کرتے ۔ واپس آ کر فوراً ناشتہ کرتے ۔ ناشتہ کے بعد حقّہ پیتے اور کتب بینی یا تصنیف و تالیف میں لگ جاتے ۔ اس وقت وہ اپنے کام میں اتنے زیادہ محو ہوتے کہ دنیا و ما فیہا کی انہیں کچھ خبر نہ ہوتی ۔ یونیورسٹی جانے کا وقت ہوتا تو والدہ محترمہ انہیں ہوشیار کرتیں اور وہ اپنے مقررہ وقت پر یونیورسٹی پہنچ جاتے ۔ دوپہر کے وقت بارہ بجنے کے فوراً بعد ان کی واپسی ہوتی ۔ کھانا کھاتے ، کچھ دیر بعد ظہر کی نماز ادا کرتے، پلنگ پر لیٹے لیٹے حقہ سے شوق فرماتے اور اخبار پڑھتے تاآنکہ نیند آ جاتی اور سو جاتے ۔ دوپہر میں قیلولہ کی عادت تھی ۔ تین اور چار بجے کے درمیان اٹھ بیٹھتے اور پھر تحقیقی کام میں مصروف ہو جاتے ۔ نماز عصر ادا کرتے اور

شام کی سیر کو نکل جاتے ۔ سیر کے وقت عام طور پر کوئی نہ کوئی شخص ان کے همراہ ضرور هوتا جسے وہ اس دوران اپنے علم سے فیضیاب کرتے ۔ مغرب تک ان کی واپسی هوتی ۔ نماز ادا کرتے اور کچھ دیر بعد رات کا کھانا کھاتے ۔ حقّہ پیتے ، افراد خانہ سے کچھ دیر باتیں کرتے ، ریڈیو پر خبریں سنتے اور اس کے بعد معمولی چھل قدمی کرتے ۔ عشاء کی نماز ادا کرتے اور اس کے فوراً بعد بتیاں گل کر دیتے ۔ رات کے وقت همیں پڑھنے لکھنے کی اجازت نہ تھی اور تاکید کی جاتی کہ سو جائیں ۔

جہاں تک غذا کا تعلق ہے والد صاحب زیادہ مرغن غذا سے پرهیز کرتے تھے ۔ اور متوازن غذا پسند فرماتے تھے ۔ گوشت کے علاوہ دسترخوان پر کم از کم ایک سبزی کا هونا ضروری تھا ۔ رات کے کھانے کے ساتھ وہ دودھ دلیا ضرور لیتے تھے ۔ انھیں کوفتے ، سری پائے ، شامی کباب اور سیخ کباب بہت پسند تھے اشیائے خورد و نوش میں زیادتی کے قائل نہ تھے ۔ ان کے نزدیک چیز قلیل مقدار هی میں کیوں نہ هو مگر عمدہ هو ۔ وہ دن میں تین روایتی کھانوں کے علاوہ بھی دو مرتبہ کچھ نہ کچھ ضرور لیا کرتے تھے ۔ جس میں پھلوں کے علاوہ نمکین اشیاء بھی هوتی تھیں ۔ شام کی چائے کے ساتھ کھانے کی کسی نہ کسی چیز کا هونا لازمی تھا ۔ انھیں شہد ، پنیر اور اصلی گھی کا بہت شوق تھا اور ان چیزوں کے حصول کی کوشش میں لگے رهتے تھے ۔ دوست احباب یہانتک کہ طلباء سے بھی ان چیزوں کی فرمائش کرتے ۔ کسی حالت میں بھی یہ چیزیں تحفتاً قبول نہ کرتے تھے ۔ خاص طور سے شاگردوں کو اصرار کرکےفوراً ادائیگی کرتے اور کہتے کہ کیا یہ کم احسان ہے کہ انھوں نے مجھے یہ چیزیں فراهم کیں ۔ دهی کی بہت تعریف کرتے تھے ۔ اور اس کے استعمال پر زور دیتے تھے ۔ شیرینی سے انھیں بہت زیادہ رغبت تھی خاص طور پر گاجر اور لوکی کا حلوا اور امرتیاں انھیں بہت پسند تھیں ۔ پھلوں میں امرود اور آم بکثرت استعمال کرتے

تھے اور فرماتے تھے کہ یہ دونوں پھل دلپسند ھیں اور مُلیّن ، اس کے علاوہ صحت بخش اور مفرّح بھی ۔ آم کا بہت شوق تھا ، عمدہ ھوں چاہے تھوڑے ھی کیوں نہ ھوں ۔ ان کے پسندیدہ آم سرولی ، دسہری اور سپیدہ تھے ۔ اگر کبھی عمدہ بنارسی لنگڑا میسر آجاتا تو وہ کھا لیتے تھے ۔ اس زمانہ میں عمدہ آم دو سے چار روپیہ سیکڑا تک مل جاتا تھا اور سیکڑا بھی ایک سو بیس کا ھوتا تھا۔

میمن منزل میں والد صاحب کا ایک مخصوص کمرا تھا جسے گھر کے افراد کتابوں والا کمرا کہتے تھے ۔ اس میں کمرے ھی کے ناپ کا مشرق وسطی سے لایا ھو ایک عمدہ قالین بچھا رھتا تھا اور ایک جانب زمین پر بیٹھ کر لکھنے کی پرانی وضع کی ڈھلوان میز رکھی رہتی تھی ۔ کمرے کے چاروں طرف بغیر دروازوں کی کتابوں کی الماریاں تھیں ۔ میرے اندازہ کے مطابق کتابوں ، قلمی نسخوں اور مسودات کی کل تعداد تین سے چار ہزار تک ھوگی ۔ ان میں تقریباً تمام کتابیں عربی کی تھیں ، چند ھی فارسی یا اردو کی تھیں اور وہ بھی بہت اھم اور نایاب قسم کی ۔ اس کمرے میں بیٹھ کر والد صاحب مطالعہ اور تصنیف و تالیف کا کام کرتے تھے ۔ ان کا مطالعہ بڑا تنقیدی ھوتا تھا وہ ساتھ ساتھ حاشیے بھی ثبت کرتے جاتے تھے ۔ کتب خانے کی ساری کتابیں ان کی پڑھی ھوئی تھیں اور ان پر حواشی تحریر تھے ۔ ان کے نزدیک مطالعہ برائے مطالعہ ایک بے معنی اور فضول کام تھا اور اسے وہ تضیع اوقات سمجھتے تھے ۔ وہ فرماتے تھے سرسری مطالعہ سے انسان حقیقی علمی کام کے قابل نہیں رھتا ۔ وہ حضرات والد صاحب کی اس رائے سے اتفاق کرینگے جنہیں اعلی علمی تحقیق و تصنیف سے کچھ بھی دلچسپی رھی ہے ۔

علی گڑھ کا قیام ان کی تحقیقی زندگی کا سنہری دور تھا ۔ انھوں نے زیادہ تر علمی کام اسی زمانے میں کیے ان کا شہرۂ آفاق اور تحقیقی شاھکار ان

کی کتاب « سمط اللآلی » ہے جسے انہوں نے خود ۱۹۳۵ء میں مصر جا کر شائع کرایا ۔ اس کتاب نے شائع ہوتے ہی دنیائے عرب میں ہل چل مچا دی اور اسی کتاب کے ذریعے انہوں نے عربی لغت اور ادب میں علمائے عرب اور محققین زبان سے اپنے عمیق مطالعہ اور تحقیق کا لوہا منوایا اس کے بعد سے عرب انہیں عربی زبان و ادب کا امام تسلیم کرنے لگے ۔ ان کی اب تک تقریباً تیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان میں سے زیادہ تر علی گڑھ کے قیام کے دوران لکھی گئیں ۔

تقسیم سے قبل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے اعلی تعلیم کا ایک مرکزی ادارہ تھا ۔ ہندوستان کے کونے کونے سے مسلمان طلباء کھنچ کر تعلیم و تربیت کی غرض سے علی گڑھ آتے تھے ۔ افریقہ ، عرب دنیا اور دیگر ممالک کے طالبعلم بھی اس گہوارہ علم کا رخ کرتے تھے ۔ دوسرے مذاہب کے طلباء کے لیے بھی اس یونیورسٹی کا دامن وسیع تھا ۔ مشرق وسطی کے اکثر سربرآوردہ حضرات اس درسگاہ کو دیکھنے اور اہل علم سے ملنے یونیورسٹی تشریف لاتے تھے رامپور حامد ہال میں انہیں سپاسنامے پیش کئے جاتے تھے ۔ یہ حضرات عربی میں خطاب کرتے تو ترجمانی کی ذمہ داری والد صاحب کو سونپی جاتی تھی اور وہ اس حسن و خوبی سے ان کی تقاریر کا ترجمہ پیش کرتے تھے کہ ترجمہ اصل پر سبقت لے جاتا تھا اور لوگ سن کر عش عش کر اٹھتے ۔ جو ان سے ناآشنا ہوتے وہ بھی انہیں پہچاننے لگتے اور انہیں یہ علم ہو جاتا تھا کہ یہاں عربی کا ایک اتنا ممتاز عالم موجود ہے ۔

میری طالبعلمی کے زمانہ میں چند اساتذہ کا نام بڑی عزت و احترام سے لیا جاتا تھا اور یونیورسٹی میں ان کی موجودگی کو باعث افتخار سمجھا جاتا تھا ۔ ان اساتذہ کے اسمائے گرامی یہ ہیں : ڈاکٹر ظفرالحسن مرحوم (فلسفہ) ڈاکٹر کریم حیدر لودھی مرحوم (معاشیات) ، ڈاکٹر ہادی حسن مرحوم

(فارسی) ، محمد حبیب مرحوم (تاریخ) اور والد محترم علامہ عبدالعزیز میمن مرحوم (عربی) ۔ علمی تحقیق ، تصانیف تالیفات کے اعتبار سے والد صاحب کو ان سب حضرات پر فوقیت حاصل تھی ۔ اس زمانہ میں حافظہ کے اعتبار سے دو نام مشہور تھے ان میں سے ایک والد صاحب اور دوسرے ڈاکٹر ھادی حسن مرحوم تھے ۔ والد صاحب کا حافظہ قابل رشک حد تک مثالی تھا ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ایک کا تعلق عربی سے اور دوسرے کا فارسی سے تھا ۔

والد صاحب کو سیاست سے مطلق لگاؤ نہ تھا ۔ نہ درسگاہ کی سیاست سے انہیں دلچسپی تھی اور نہ ملک کی ۔ درسگاہ کی سیاست میں ملوث حضرات سے ملنا جلنا بھی پسند نہ فرماتے تھے ۔ ان کے نزدیک انسان کو اپنا مقام اپنی محنت سے حاصل کرنا چاھئے اور اپنے پیچھے ایسا تحقیقی کام چھوڑنا چاھئے کہ آنے والی نسلیں کبھی فراموش نہ کر سکیں ۔ خوشامد پرستی ان کے مزاج کے خلاف تھی اور اپنی خودداری کو مجروح کرنا انہیں گوارا نہ تھا ۔ وہ کہتے تھے کہ یہ دونوں کام ، یعنی اپنے مضمون کی خدمت اور درسگاہ کی سیاست ، بیک وقت نہیں ہو سکتے ۔ انسان کو ان دونوں میں سے کسی ایک کو پسند کرنا پڑتا ہے ۔ ظاہر ہے اول الذکر میں عزت ہے ، نام نمود ہے اور کسی حد تک بقا بھی جبکہ مؤخر الذکر میں سراسر خسارہ ہے اور بعض اوقات رسوائی بھی ۔ اخبار ھمیشہ باقاعدگی سے پڑھتے ، ریڈیو پر خبریں بھی سنتے تھے اور اس طرح اپنے آپ کو ملک کے حالات سے باخبر رکھتے تھے ۔ سیاسی مسائل پر کبھی کسی سے گفتگو نہ کرتے اور اگر کوئی کچھ پوچھنے کی ھمت کر ھی بیٹھتا تو بلا جھجک بغیر کسی ذھنی تحفظ کے اپنے خیالات کا اظہار کر دیتے ۔ مسلمانوں کی زبوں حالی کا انہیں بہت دکھ تھا اور ان کی نظر میں ھماری موجودہ پستی کا سبب مغربیت کا غلبہ اور اسلام سے بُعد تھا ۔ ان کے نزدیک اصلاح کا واحد ذریعہ فہم قرآن تھا ۔

والد صاحب رہن سہن میں قدیم وضع کے پابند ، سادگی پسند اور تصنّع سے مبرّا تھے ۔ تہذیب و شائستگی کی حدود کو برقرار رکھتے ہوئے ہر چھوٹے بڑے سے بے تکلف ہو کر باتیں کرتے تھے ۔ لوگوں سے دوستی کے زیادہ قائل نہ تھے اور فطرتاً گوشہ نشین تھے ۔ اتنے علم و فضل کے باوجود غرور و تمکنت ان میں نام کو نہ تھا ۔ لوگوں سے تعلقات انسانیت اور شرافت کی بنیاد پر استوار کرتے تھے نہ کہ ان کی امارت یا معاشرے میں ان کے بلند مقام کی بنیاد پر ۔ ہماری کوٹھی میمن منزل کے قریب نابینا طلباء کا ایک اسکول تھا جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک سابق وائس چانسلر صاحب زادہ آفتاب احمد خان مرحوم نے قائم کیا تھا ۔ اس اسکول کے صدر مدرّس جو خود بھی نابینا تھے ان کے ساتھ والد صاحب کے پرخلوص مراسم تھے ۔ دونوں کے مراتب میں زمین آسمان کا فرق تھا مگر والد صاحب تقریباً ہر شام کچھ دیر کے لئے ان سے ملنے ضرور جاتے تھے ، خیریت پوچھتے تھے ، ادھر ادھر کی باتیں کرتے تھے اور ساتھ ساتھ حقّہ سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے ۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ان کا نام احمد سعید یا محمد سعید تھا ۔ والد صاحب کا اپنے یونیورسٹی کے رفقاء میں دوستوں کا دائرہ بہت ہی محدود تھا ۔ جن حضرات سے والد صاحب کا ملنا جلنا تھا ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں ؛ مولوی ابوبکر شیث صاحب مرحوم (دینیات) ، بشیرعلی صاحب مرحوم (کیمیا) ، عزیزاحمد صاحب مرحوم (ریاضی) ، ڈاکٹر ہادی حسن صاحب مرحوم (فارسی) ، احسن مارہروی صاحب مرحوم (اردو) ، ڈاکٹر ظفرالحسن صاحب مرحوم (فلسفہ) ، ڈاکٹر فیاض صاحب مرحوم (یونیورسٹی ہسپتال) ، منظور حسین خان صاحب مرحوم (برسر) اور صدر یار جنگ نواب حبیب الرحمن خان شروانی مرحوم ۔ صدر یار جنگ کو عربی سے بہت زیادہ شغف تھا ، عمر میں والد صاحب سے بڑے تھے اور والد صاحب ان کا بہت احترام کرتے تھے ۔

۱۹۴۲ء میں میں نے اپنی تعلیم مکمل کی اور اس کے بعد ملازمت کے سلسلے میں مجھے علی گڑھ چھوڑنا پڑا ۔ تقسیم کے وقت میں ٹیچرس ٹریننگ کالج اجمیر میں لکچرار تھا ۔ والدین سے ملنے کی غرض سے سال میں کم از کم ایک مرتبہ علیگڑھ جانیکا اتفاق ضرور ہوتا تھا ۔ جب بھی میں علیگڑھ گیا کبھی میں نے والد صاحب کے روزمرہ کے معمولات میں کوئی فرق نہ پایا ۔ یونیورسٹی میں پڑھانے کے بعد گھر پر ان کا سارا وقت تحقیق و تصنیف میں گزرتا تھا اور انہیں اس سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا ۔ میں بوجہ فسادات اجمیر سے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں اپنی اهلیہ کے ساتھ عارضی قیام کی غرض سے پاکستان آ گیا اور حیدرآباد میں قیام کیا ۔ اس کے بعد حالات اتنے بگڑے کہ پھر ہندوستان جانا نصیب نہ ہوا ۔ ۱۹۵۰ء میں والد صاحب یونیورسٹی علی گڑھ سے پروفیسر اور صدر شعبۂ عربی کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ۔ ایک سال کی توسیع کی مدت بھی گزاری اور ۱۹۵۱ء میں حتمی طور پر ملازمت سے سبکدوش ہوگئے ۔ اسکے بعد بھی انہوں نے علیگڑھ ہی میں قیام کیا ۔ ۱۹۵۴ء میں وہ مجھ سے ملنے کے لئے متعلقین کے همراہ پاکستان تشریف لائے اور اس ءارضی قیام کے دوران هی وزارت تعلیم حکومت پاکستان نے انہیں مرکزی ادارۂ تحقیقات اسلامی کا پہلا ڈائریکٹر مقرر کر دیا جس کی ذمہ داری انہوں نے ۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو سنبھالی ۔

****